محمد حنیف ندوی

تاثرات

(مسلسل)

احیاء اسلام کے فکری و عملی تقاضے

ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بیک وقت تشریح و تفسیر سے متعلق بھی ہے، اخلاقیات کے دائروں کو بھی متاثر کرتا ہے، اور تہذیبی و تمدنی اقدار کی تعیین و وضاحت میں بھی، اہم کردار کا حامل ہے۔ بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہی وہ خشتِ اوّل یا کونے کا پتھر ہے کہ جس پر پوری تعمیر کے حسن و جمال کا انحصار ہے۔ تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ قرآن حکیم میں دونوں قسم کی آیات پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی کہ جن میں دنیا کے جمالیاتی پہلوؤں کو ایک ایک کر کے نکھارا اور اجاگر کیا گیا ہے۔ اور خصوصیت سے غور و فکر اور تدبّر و تذکار کی دعوت دی گئی ہے۔ جن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ حسین و جمیل نظام مکمل حکمت اور حیران کن ریاضی پر مبنی ہے اور اس میں کوتاہی اور نقص کا کوئی شائبہ پایا نہیں جاتا۔ جن میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ زندگی اتنی اہم، اتنی عظیم اور اس درجہ ایمان و اقدار کی خرد افروز ذمہ داریوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے کہ اس کا متحمل پوری کائنات مادی میں صرف انسان کا دل گردہ ہی ہو سکتا تھا۔

یہی نہیں اس میں ایسی آیات بھی ہیں کہ جن میں زندگی کے نقشوں کو حسین سے حسین تر بنانے کے لیے ہدایات، قوانین اور شرائع کی پوری پوری تفصیلات مذکور ہیں۔ اور جن میں پوری وضاحت سے اس مسئلہ کو طے کر دیا گیا ہے کہ ایمان کے ساتھ عمل، سعی و تگ و دو اور جہاد ہی وہ معیار ہے کہ جس کی رو سے کسی شخص کا روحانی، تہذیبی

اور اخروی درجہ متعین ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں ایسی آیات کی بھی کمی نہیں کہ جن میں دنیا کو متاع غرور، لہو و لعب، اور محض عبوری منزل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اصلی اور دائمی زندگی وہی ہے جسے آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یعنی جہاں تک حکمت و دانش کے اس بحر بے کراں کا تعلق ہے جسے ہم قرآن کہتے ہیں اس میں دنیا دوستی اور دنیا دشمنی دونوں قسم کی رَوئیں ساتھ ساتھ اور پہلو بہ پہلو جاری ہیں۔

لہٰذا جدید مفسر کا یہ فرض ہے کہ وہ اس پیچیدگی کو دور کرے، اور ایک ایسا فیصلہ کن قدم اٹھائے کہ جس سے ایک طرف تو یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلام کا حقیقی نصب العین کیا ہے؟ اور وہ اس گہوارۂ تہذیب و تمدن کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ عزت و توقیر کی نظر سے یا تحقیر و مذمت کی نظر سے؟ دوسری طرف یہ اشکال بھی رفع ہونا چاہیے کہ قرآن کی اصطلاح میں دنیا کے کیا معنی ہیں؟ کیا اس عالمِ رنگ و نکہت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یا نفس و خواہشات کے ادنیٰ تقاضوں پر۔ اس سوال کا گہرا تعلق اخلاقیات اور مسائل تمدن سے یوں ہے کہ اگر یہ عالم بجائے خود مقصود بالذات ہے، اگر ہمیں یہاں بہر حال رہنا ہے، اور یہیں رہ کر روحانی، تمدنی اور تہذیبی اقدار کو پروان چڑھانا ہے، اور اپنی اسی گوشت پوست کی زندگی کو مزرعہ آخرت اور ذریعۂ فلاح ٹھہرانا ہے، یہیں رہ کر قلب و روح کی صیقل گری کے فرائض انجام دینا ہے۔ اور فکر و ذہن کے جملہ لطائف و ترقیات کو تابش و نور سے آشنا کرنے کا فرض انجام دینا ہے۔ تب ہمارے دائرۂ اخلاق میں زندگی کے تمام ظہورات داخل ہوں گے۔ اس صورت میں ایک کاریگر کا وہ عمل جو پیداوار کو بڑھاتا یا انسانی آسائش میں کسی حد تک اضافہ کا موجب ہوتا ہے وہ بھی اخلاقی فعل ہوگا۔ ایک آرٹسٹ کی وہ فنی تخلیق جو ذوق و روح کی تشنگی کو دور

کرے اور معانی و کیف کی دنیا میں پہنچا دینے کا سبب ہو اس پر بھی اخلاقی عمل کا اطلاق ہوگا۔ اور اسی طرح ہم ایک سائنس دان کی ان کوششوں کو بھی اخلاقی و روحانی قرار دیں گے جو وہ اپنی تجربہ گاہ میں بیٹھ کر تسخیر کائنات کے سلسلہ میں انجام دیتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کو اپنانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم دنیا کی تمام گہما گہمیوں میں اعتماد، جرأت اور امید و رجا لیے ہوئے شریک ہوں گے اور وہ سب کام کریں گے جس سے ایک اچھا تمدن ظہور میں آتا ہے۔ ایک بہتر تہذیب پیدا ہوتی ہے اور خوش گوار اور ترقی یافتہ معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ مگر اس بنیادی شرط کے ساتھ کہ ان تمام مساعی کا رخ رضائے الٰہی کی طرف ہو۔ اور ان سب کوششوں کی تہہ میں عام بنی نوع انسان کی فلاح و سعادت کا جذبہ موجزن ہو۔

اور اگر اس کے برعکس یہ دنیا محقر ہے، ناقابل اعتماد ہے، یا جس طرح غزالی کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت حج کے اس اونٹ سے زیادہ نہیں کہ جس پر سوار ہو کر ایک مسلمان حج و زیارت سے مشرف ہوتا ہے تو پھر اخلاقیات کے دائرے سے وہ تمام انفرادی و اجتماعی کوششیں خارج ہو جاتی ہیں جن کا تعلق تمدن آفرینی یا زندگی کے گوناگوں تقاضوں کی تکمیل سے ہے۔ اس موقف کو تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں ایک ناچار اور مجبور زندانی کی طرح بس چند ہی روز کے لیے رہ رہے ہیں۔ نہ یہ ہمارا مستقل گھر ہے، نہ ہمیں یہاں اعتماد سے رہنا ہے۔ اور نہ اس بات ہی کی ضرورت ہے کہ اس کی تزئین و آرائش کے لیے کوئی بڑھ چڑھ کر اہتمام کیا جائے۔ یہاں کے تہذیبی مسائل، تمدنی تقاضے سیاسی ہنگامے، اور علمی کاوشیں ہمارے لیے یکسر بے معنی ہیں۔ ہمیں ان سب چیزوں سے دامن کشاں ہو کر اور ان تمام فضولیات سے ہٹ کر اپنی تمام تر کوششوں کو صرف فکرِ آخرت پر مرکوز کر دینا چاہیے۔

اس مرحلہ پر ہم یہ فلسفیانہ سوال نہیں اٹھانا چاہتے کہ کیا دنیا سے کنارہ کشی کسی

صحت مند اخلاقی نظام کو جنم دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں ۔ اور آیا "حسنِ دنیا" کے بغیر "حسنِ آخرت" کا کوئی تصور ذہن کی گرفت میں آتا بھی ہے یا نہیں ۔ ہم اس پوزیشن میں بھی نہیں ہیں کہ غزالی کی پیش کردہ تمثیل میں جو کھُلا ہوا گھپلا ہے اس کی نشاندہی کریں ۔ اور بتائیں کہ دنیا و آخرت میں جو فاصلہ ہے وہ صرف ادنیٰ و اعلیٰ اقدار کا ہے ، یا ذہن و فکر اور انداز و نقطۂ نگاہ کا ہے جس کو ایمان و عقیدہ کی ایک ہی جست میں طے کیا جا سکتا ہے ۔ اس بنا پر سواری یہ دنیا نہیں بلکہ وہ اندازِ فکر ہے جو ان فاصلوں کو ختم کر دینے میں ممد و معاون ہوتا ہے ۔ اور پھر جب وہ فاصلے نقطۂ نگاہ کی صحت و استواری سے ختم ہو جائیں تو اس دنیا کی حیثیت منازلِ حج میں سے ایک نہایت ضروری اور لائقِ احترام منزل کی ہو جاتی ہے ۔ ہم یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا کے درجہ و موقف کی صحیح صحیح تعیین کس درجہ ضروری ہے اور یہ کہ ہمیں سوچ سمجھ کر اس سوال کا ایسا جچا تلا جواب دینا چاہیے کہ جس کی روشنی میں ہم نئی زندگی کا ڈول ڈال سکیں ۔